انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-32

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ - شمارہ ۱۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ مارچ ۱۹۶۷ء

اداریہ

اتر پردیش میں اردو کے لیے سہولتیں؟
(۲)

پچھلے شمارے میں ہم نے ریاستی حکومت کے فولڈر پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ ابتدائی تعلیم کی منزل پر ضلع پریشد کے زیر اہتمام جو تمام اسکول ہیں ان میں اردو کے اسکولوں کے اعداد و شمار نہیں دیے گئے ہیں دوسرے یہ بھی واضح نہیں کیا گیا ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں اردو کے اسکولوں میں کیا اضافہ ہوا۔ یہ اعداد و شمار دیے جاتے تو معلوم ہوتا کہ اضافہ تو درکنار یہاں تو اور کمی ہوئی ہے۔ مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھنے والوں اور ان پر حکومت کی امداد کے جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ ریاست کی وسعت اور آبادی کو دیکھتے ہوئے ایسے نہیں کہ کوئی ریاست ان پر فخر کر سکے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دینی تعلیمی بورڈ اور دوسرے اداروں نے اپنی کوشش سے خاصی تعداد میں اسکول چلائے ہیں اور ان میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد اگر گھٹا دی جائے تو ریاست کے اسکولوں یا مکتبوں کے طلبا کی مجموعی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لسانی اقلیتی کمشنر نے ساتویں رپورٹ میں واضح کیا ہے کہ خواندگی میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا عکس لسانی اقلیتوں کے اردو میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد میں نظر نہیں آتا۔ یہی ریاست کی کوششوں پر سب سے جامع تبصرہ ہے۔ دستور میں دفعہ ۳۵۰ الف کے تحت ریاستی حکومت کا فرض ہے کہ اس سلسلے میں پوری کوشش کرے، اگر کوشش تو درکنار، توجہ کا بھی کوئی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔

ثانوی تعلیم کی کہانی اس سے زیادہ المناک ہے۔ یہ اصول ماہرین تعلیم نے، یک جہتی کونسل نے اور بڑے وزیروں کی کانفرنس نے تسلیم کر لیا ہے کہ لسانی اقلیتوں کی زبانیں ثانوی منزل پر بھی ذریعہ تعلیم ہوں گی اتر پردیش میں ایک بھی اسکول ایسا نہیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جب کہ پڑوسی ریاست بہار میں جہاں اردو داں طبقے کی آبادی اتر پردیش سے کم ہے یہ تعداد خاصی ہے اور وہاں ایسے اسکول بھی ہیں جہاں اردو ثانوی منزل پر ذریعہ تعلیم ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ لسانی فارمولے کے تحت پانچ طالب علم اگر اردو پڑھنا چاہیں تو ان کا معقول بندوبست کیا جاتا ہے، اور اس مقصد کے لیے [illegible] چھبیس استاد مقرر کیے گئے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ان طلبا کو جن کی مادری زبان اردو ہے تیسری زبان کے طور پر بھی اردو لینے کی اجازت بڑی مشکل سے اور بڑی چیخ پکار کے بعد ملتی ہے ورنہ زیادہ تر انھیں سنسکرت لینی پڑتی ہے اور ریاست میں اردو داں طبقے کی آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت ہی کم ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھنے والے طلبا کی تعداد اور انھیں امداد کے اعداد و شمار تو دیے گئے ہیں مگر ابتدائی منزل پر ضلع پریشد کے تحت ان طلبا کی تعداد نہیں دی گئی جو اردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں، نہ ان طلبا کی تعداد دی گئی ہے جو سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھتے ہیں اور نہ ان طلبا کی تعداد کے متعلق کچھ کہا گیا جو ہائی اسکول کی منزل پر اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں۔

دراصل اتر پردیش کی سرکار نے تعلیم کے لیے بہت کم سہولتیں اردو پڑھنے والوں کو دی ہیں اور اصلیت سبھی کو معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس فولڈر سے کون متاثر ہوگا۔

سرکاری کاموں میں عدالتوں، دفتروں، دستاویزات کی رجسٹری اور عام سرکاری کاموں میں اردو جاننے والوں کے لیے مختلف سہولتوں کا جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی مبالغہ آمیز ہے۔ دستاویزوں کی رجسٹری تو اب اردو میں ہو جاتی ہے بشرطیکہ رجسٹرار یہ نہ کہے کہ میں اردو نہیں جانتا، عدالتوں میں اردو میں عرضی کے ساتھ ہندی میں اس کی نقل داخل کرنی پڑتی ہے جن ضلعوں کی فہرست رجسٹری کی دستاویزوں کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے وہ وہی ہیں جہاں اردو داں آبادی اتنی ہے کہ انھیں خاص ضلع تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دوسرے ضلعوں کے اعداد و شمار ہوتے تو معلوم ہوتا کہ عام طور پر اتر پردیش میں یہ سہولتیں مہیا نہیں ہیں۔

اہم قوانین اور اعلانات کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ عام طور سے ان کے خلاصے زیادہ تر اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خلاصے

شائع کرنے سے قوانین اور اعلانات کا مقصد حل نہیں ہوتا اور پھر یہاں اردو کتنے لوگ پڑھتے ہیں۔ انھیں گزٹ میں شائع کرکے اور سارے قوانین اور اعلانات کو اردو داں طبقے تک پہنچانے میں حکومت کیوں بخل کرتی ہے؟

جن اضلاع میں اردو داں آبادی کل آبادی کی پندرہ یا بیس فیصدی ہے ان میں سارے دستاویزوں کی فہرست اردو میں ضرور شائع کی گئی ہے۔ مگر جن اضلاع میں آٹھ دس فی صدی ہے وہاں کیوں نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ سہولتیں تو عام ہونی چاہئیں کیونکہ ان کے حق پر تو پورے دستوری نظام کا انحصار ہے۔

سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں ہندی کے لازمی پرچے کی بڑی صفائی پیش کی گئی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے نزدیک اس لازمی پرچے سے امتیاز ضرور ہوتا ہے اس لیے اس شرط کو اڑا دینا چاہیے۔ اِن ملازمت کے بعد ہندی کا کوئی امتحان لازمی طور پر پاس کرنے کی شرط ضرور رکھنی چاہیے۔

اردو مصنفوں کو کچھ انعامات ضرور دیے گئے ہیں اور یہ ایک اچھا قدم ہے مگر اس سلسلے میں انعامات کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے اور کل انعامات کی رقم میں سے اردو انعاموں کی رقم اردو داں آبادی کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔

اردو اخبارات کو اشتہارات وغیرہ بھی اردو آبادی کے تناسب سے دینا چاہئیں اور دیہات میں جو کتب خانے کھولے گئے ہیں ان میں اخبارات اور کتابیں بھی اس تناسب سے ضرور خریدنا چاہئیں۔ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اتر پردیش کی حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ اردو کی توسیع اور ترقی کے لیے وہ سب کر رہی ہے جو ایک قومی حکومت ملک کی ایک قومی زبان کے لیے کر سکتی ہے" بالکل غلط ہے۔ اتر پردیش کی حکومت نے اس سلسلے میں بڑی غفلت برتی ہے۔ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور اس کی وجہ سے اردو داں آبادی میں بجا طور پر سخت شکایت اور برہمی ہے اور جب تک حکومت واقعی اس شکایت اور برہمی کو دور نہیں کرتی اس قسم کے دعوے نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہیں اور کوئی بھی ان سے کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

غیر ممالک سے اردو نشریات کے متعلق ڈیڑھ لاکھ خطوط

نئی دہلی ۔ ۲۰ فروری ۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ وزیر اطلاعات و نشریات کی صدارت میں ہوئی جس میں وزارت وفاع کے سکریٹری مسٹر دی شنکر کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر نارائن اسمیتھن شریک تھے۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ اردو کے کمنام ادیبوں اور فن کاروں کو بھی پیش کیا جائے۔

مزید فیصلہ کیا گیا ہے کہ روزانہ ۹ گھنٹوں سے زیادہ اردو پروگرام ہوں جس میں اردو اہل قلم حضرات اور شعرائے کرام کی چیدہ چیدہ چیزیں پیش کی جائیں۔

کمیٹی کے چند ممبروں نے صلاح دی کہ مذہبی کتابوں کی بنیاد پر ایسے ایسے اقتباسات اور ایسی چیزیں بھی پیش کی جائیں جن کی آفاقی قدر کو مسلم ہیں۔ کمیٹی کی میٹنگ میں وزیر موصوف نے انکشاف کیا کہ دنیا کے مختلف حصوں سے غیر ملکی اردو پروگراموں کے سلسلے میں ڈیڑھ لاکھ مکتوبات آل انڈیا ریڈیو کو موصول ہوئے۔ (دعوت، دہلی)

انڈیا آفس لائبریری کی نئی عمارت میں منتقلی

لندن ۔ ۱۲ فروری ۔ انڈیا آفس کی عمارت اور اس کے ریکارڈ کے بارے میں برطانیہ ہندستان اور پاکستان میں بات چیت عرصہ سے جاری ہے ساتھ ہی اس منصوبہ پر عمل کیا جا رہا ہے کہ اس لائبریری اور ریکارڈ کو کسی ایسی جگہ منتقل کیا جائے جہاں دنیا بھر کے طلبا آسانی سے اس کی نایاب دستاویزات اور کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

تاہم دولت مشترکہ کی طرف سے واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ اس کا اثر ہندستان، پاکستان کے ان دعووں پر کچھ نہیں پڑے گا جو انھوں نے اس کی ملکیت کے بارے میں کر رکھے ہیں۔

ان کتابوں اور دستاویزوں کی فراہمی کی ابتدا ۱۶۰۰ء میں ہوئی اس لائبریری کی قدیم ترین دستاویزات میں اس زمانے کے تاجروں کے کاروبار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد برطانیہ کی بالادستی میں اضافہ ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ہی دستاویزوں کی تعداد بڑھتی رہی، سرکاری رپورٹیں اس پر مستزاد تھیں۔

جنرل کلائیو اور جنرل آئرکوٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر واقع لندن کو اپنی جنگوں کے بارے میں جو رپورٹیں بھیجیں وہ ان میں شامل ہیں۔ ان کے بعد کے گورنر جنرلوں نے جو رپورٹیں اور یادداشتیں بھیجیں وہ بھی ریکارڈ میں شامل ہوتی رہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں ہندستان کی ثقافت اور آرٹ میں بہت دلچسپی لی جانے لگی چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کے بارے میں بہت سی کتابیں خریدیں اور اپنے لندن کے دفتر میں جمع کر دیں۔

غالباً انڈیا آفس کی لائبریری اپنی نوعیت کی واحد لائبریری ہے جو ایک سرکاری محکمہ نے قائم کی۔ ایک سو سال قبل جب انڈیا آفس تعمیر ہوا تو اس لائبریری کو موجودہ عمارت (وائٹ ہال) میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب یہ لائبریری اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس عمارت میں مشکل سے سماتی ہے۔ اب اس لائبریری کو ایک نئی عمارت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ عمارت ایرکنڈیشنڈ ہے اور اس کا درجۂ حرارت اتنا رکھا گیا کہ کتابیں اور ریکارڈ خراب نہ ہونے پائے۔

اس لائبریری کے تصاویر کے شعبہ میں کوئی ۱۸ ہزار تصاویر ہیں۔ اس لائبریری اور ایک مطالعہ خانے میں طلبا آپ کی مشینوں سے کام لیں گے اور ضروری نوٹ لے سکیں گے۔ اس لائبریری میں اور بھی کئی سہولتیں ہوں مثال کے طور پر اس میں بحث مباحثہ کے لیے ایک کمرہ ہوگا۔ ایک کافی روم ہوگا اور ایک کمرے میں طلبا کے لاکر ہوں گے۔ اخباروں، رسالوں، یورپین کتابوں، مشرقی کتابوں اور یورپین مسودات کے لیے الگ کمرے ہوں گے۔ (قومی آواز)

سید مسعود حسن رضوی ادیب

میر حسن کے بیٹے

مندرجہ بالا عنوان سے محمد انصار اللہ صاحب کا ایک مضمون ہماری زبان مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۹۷ء میں شایع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے میرے مقالے[1] "میر حسن کے بڑے بیٹے میر احسن خلق" کے ایک جز سے اختلاف کیا ہے۔ میں نے اس مقالے میں میر حسن کی اولاد کے بارے میں دو بیان نقل کیے ہیں ایک بیان افسوس لکھنوی کا ہے اور دوسرا مجموعۂ سخن کے مولفوں کا جن میں قدر بلگرامی بھی شامل ہیں۔ پہلے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ میر حسن کے انتقال کے بعد ان کے چار بیٹے موجود تھے، جن میں دو میر مستحسن خلیق اور میر محسن فیض آباد میں بہو بیگم کے داماد مرزا تقی کے رفیق تھے، تیسرے میر احسن خلق داراب علی خاں ناظر کے ساتھ تھے۔ چوتھے بیٹے کا نام و نشان کچھ نہیں بتایا ہے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ "میر حسن تین بیٹے چھوڑ کر مرے تھے، جن کے تخلص خلیق، مخلوق اور خلق ہیں"۔

ان بیانوں میں دو اختلاف ہیں، پہلے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کے چار بیٹے تھے اور دوسرے سے یہ کہ تین بیٹے تھے۔ پہلے بیان کے مطابق خلق اور خلیق کے علاوہ میر حسن کے ایک بیٹے کا تخلص محسن تھا اور دوسرے کے مطابق مخلوق۔ میں نے دو وجہوں سے دوسرے بیان کو ترجیح دی ہے۔ ایک وجہ یہ کہ محسن کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے اور مخلوق کا ذکر مصحفی نے ریاض الفصحا میں اور ناصر نے خوش معرکۂ زیبا میں کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ خاندانی روایت سے بھی اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔

انصار اللہ صاحب افسوس کے بیان کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں اور اس کے لیے دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ "خاندانی روایتیں بھی شہرت پر مبنی ہوتی ہیں اور ان میں بھی غلطی کے امکانات ہوتے ہیں"۔ دوسری دلیل میرا یہ قول ہے کہ افسوس میر حسن کے دوست تھے اور دس برس تک ان کے ساتھ ایک ہی سرکار میں ملازم رہے تھے۔

ان کی پہلی دلیل کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ غلطی کا امکان تو ہر روایت میں ہوتا ہے، مگر اس خاندانی روایت میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی میر انیس کے حقیقی نواسے میر سید علی مانوس ہیں جو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد میر انیس کے انتقال تک دس برس کی عمر سے تئیس برس کے سن تک ستّرہ سال اپنے نانا کے ساتھ رہے تھے۔ میں نے ان سے میر انیس کے کچھ حالات دریافت کر کے اب سے پینتیس برس پہلے ایک مضمون "میر انیس کے کچھ چشم دید حالات"[2] کے عنوان سے شایع کیا تھا۔ ان سے زیادہ واقفِ حال اور معتبر راوی اور کون ہو سکتا تھا۔

ان کی دوسری دلیل کے بارے میں گزارش ہے کہ دس برس تک ایک ہی سرکار میں ملازم رہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ افسوس کو میر حسن کے بیٹوں کے [illegible] حالات معلوم ہوں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ میں اپنے جن رفقائے کار کے ساتھ دس برس سے بہت زیادہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم رہا ان کے بیٹوں کی صحیح تعداد اور ان سب کے نام مجھ کو معلوم نہیں ہیں۔ شاید ہر شخص کا تجربہ یہی ہو گا۔ اور افسوس کی ناواقفیت تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ چوتھے بیٹے کا نام نہیں بتا سکے۔ اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ افسوس کے بیان کو معتبر خاندانی روایت پر ترجیح دی جائے۔

میں نے اپنے مقالے میں میر احسن خلق کی تصنیف طب احسن کا ذکر کیا ہے اور اس نادر کتاب کا دیباچہ نقل کر دیا ہے جس کو مصنف نے اس جملے پر تمام کیا ہے "در عہد...... بادشاہ جہاں غازی الدین حیدر بہادر .... تحریر یافتہ در یک ہزار و دو صد و سی و سہ سال ہجری ...... اتمام یافت"۔ یعنی طب احسن بادشاہ جہاں غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھی گئی اور ۱۲۳۳ ہجری میں تمام ہوئی۔ انصار اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> "غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۴ھ میں بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔ ۱۲۳۳ھ میں ان کو بادشاہ جہاں لکھنا ممکن نہیں۔ یقینی طور پر یہ عبارت ۱۲۳۴ھ یا بعد کی ہے اور اس میں مذکورہ سنہ بھی غلط ہے۔ طب احسن کی ۱۲۳۳ھ میں تکمیل سمجھنا یقیناً غلط ہے۔"

ہمارے محقق اکثر کسی نتیجے تک پہنچنے میں جلد بازی اور سطح بینی سے کام لیتے ہیں۔ مصنف کے بتائے ہوئے سنہ تصنیف کو اس آسانی سے غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۴ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان نہیں کیا تھا، تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ اور سال جلوس لازماً بادشاہی کا سال آغاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ ہونے کے بعد جشن جلوس کے انتظامات میں بہت وقت لگتا ہے۔ غازی الدین حیدر کا جلوس جس تزک و احتشام

[1] دیکھیے ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ مورخہ اگست ۱۹۶۵ء

[2] دیکھیے ماہ نامہ ادب، لکھنؤ مورخہ نومبر ۱۹۳۱ء

سے ہوا تھا اس کے انتظامات میں ایک سال سے زیادہ وقت ضرور صرف ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ جلوس کے انتظامات بادشاہ ہونے کے بعد ہی شروع کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر اپنے سال جلوس ۱۲۳۴ھ سے کم از کم ایک سال پہلے بادشاہ ہو چکے ہوں گے اس لیے میر احسن کا ۱۲۳۳ھ میں ان کو بادشاہ جمجاہ لکھنا بالکل درست ہے اور انصار اللہ صاحب کا یہ قول بے بنیاد ہے کہ "طب احسن کی ۱۲۳۳ھ میں تکمیل سمجھنا یقیناً غلط ہے۔"

غازی الدین حیدر کے بادشاہ ہونے اور تخت شاہی پر جلوس کرنے کی روداد انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ انگریز دلی کا رہا سہا وقار ختم کرنے کے درپے تھے۔

ان کے ایما سے غازی الدین حیدر نے گورنر جنرل سے اپنے بادشاہ ہونے اور اپنا سکہ جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ گورنر جنرل نے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ آپ کو اپنے ملک میں ہر طرح کا اختیار ہے۔ سرکار کمپنی بہادر کو کسی طرح مداخلت منظور نہیں۔ اس کے بعد سرکار کمپنی بہادر نے ایک اشتہار چھپوا کر خاص و عام میں مشہور کر دیا[1]۔ اب غازی الدین حیدر بادشاہ ہو گئے اور ان کی تخت نشینی کے انتظامات ہونے لگے۔ قیصر التواریخ میں ہے "کروڑ روپیہ ...... تیاری تخت و سامان شاہی و اسباب جلوس میں صرف ہوا[2]۔" تاریخ اودھ میں ہے کہ چتر و تخت و شامیانہ اور لوازم شاہی دو کروڑ روپے میں تیار کئے گئے[3]۔ بوستان اودھ میں ہے کہ تخت و تاج کی تیاری میں دو کروڑ اور دوسرے سامان بادشاہی میں کروڑہا روپیہ صرف ہوا[4]۔ اس ساری تیاری کے بعد جلوس کا جشن عظیم ترتیب دیا گیا اور ۱۸ / ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کو غازی الدین حیدر نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔

غازی الدین حیدر کے لیے جو تخت شاہی تیار کیا گیا وہ چاندی اور سونے کا تھا اور اس کے چاروں طرف لعل، زمرد، یاقوت، فیروزہ، پکھراج، موتی اور مونگے کے چار حاشیے اس طرح لگائے گئے تھے کہ وہ تاروں بھرے آسمان کی بہار دکھاتا تھا۔ تخت پر سرخ مخمل کی مسند بچھی تھی اور اوپر

[1] قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۳۲-۲۳۳
[2] قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۳۳
[3] تاریخ اودھ حصہ چہارم ص ۱۲۳
[4] بوستان اودھ ص ۱۱۳

زربفت کا ایک شامیانہ تھا جس کی جھالر موتیوں اور منقیش کی تھی، جو میں سونے چاندی کی تھیں اور وہ کلابتوں کی ڈوریوں سے تنا ہوا تھا۔ تخت کے سامنے ایک دوسرا شامیانہ نصب کیا گیا تھا جس کا طول و عرض چالیس گز اور بیس گز تھا اور جس کی تیاری میں سلمہ، ستارہ، منقیش اور کلابتوں صرف ہوا تھا[1]۔

کروڑوں روپے کا یہ مرصع، جواہر نگار سامان تیار کرنے میں ڈیڑھ دو برس ضرور لگے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غازی الدین حیدر ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ سے ڈیڑھ دو برس پہلے بادشاہ ہو چکے تھے۔ کسی کے بادشاہ ہونے اور تخت سلطنت پر جلوس کرنے کے درمیان میں دو ڈیڑھ سال کا بلکہ اس سے زیادہ فصل ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس لیے طب احسن میں جو ۱۲۳۳ھ کی تصنیف ہے مصنف کا غازی الدین حیدر کو بادشاہ جمجاہ کہنا بالکل درست ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ طب احسن ۱۲۳۴ھ یا اس کے بعد تصنیف کی گئی۔

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم ص ۱۲۳

غزلیں

(ہندی غزل)

کرشن موہن

چھا گئی ہیں گھٹائیں ساون کی　　کامنائیں ہیں یہ بھی بندھن کی
بے کلی کہہ رہی ہے نینن کی　　پیاس رہتی ہے ان کو درشن کی
ہر ادا بولتے ہوئے ان کی　　فتنہ خو لہا ہے تیرے جوبن کی
میری آنکھوں میں ڈال دے آنکھیں　　دور ہوں سب اداسیاں من کی
لب پہ رہتا ہے نام ساجن کا　　دل میں رہتی ہے یاد ساجن کی
تیرے ہونٹوں میں رس محبت کا　　تیرے نینوں میں جوت جیون کی
ق
سر میں پیدا کیا ترا سودا　　دل میں "چھپتا چھپا" بھی درشن کی
پھر بھی تیرا پتہ نہیں پایا　　ہم نے چھانی ہے خاک بن بن کی
سر ہوئی ہے لگاوٹ سجاؤ　　ایک دولت یہی ہے نردھن کی
خود تو سنسار کو ہوئے ارپن　　کلپنا ہم نے تجھکو ارپن کی
تو نے دیکھا تو جگمگا اٹھا　　جاگ اٹھی قسمت آج درپن کی
تیرا جوبن یہ تیرا روپ انوپ　　اک جھلک میرے دل کے درپن کی
انکھڑیوں میں ہے دامنی کی چمک　　پلکوں میں ہیں گھٹائیں ساون کی
اب انھیں کس طرح منائیں ہم　　ہو کوئی وجہ بھی تو ان بن کی
تیرے قدموں کی چاپ سنتا ہوں　　یا صدا اپنے دل کی دھڑکن کی
مقبرے کا دیا اداس اداس　　جیسے جلتی ہو آس برہن کی
سارے سنسار میں اجاگر ہے　　موہنی تیری شوخ چتون کی
تیری چاہت نے چھین لی راحت　　یہ کہانی ہے ایک بیرن کی
چند گھڑیوں کے واسطے لوٹ آئیں　　کاش وہ شوخیاں لڑکپن کی
ذہن کی لہر ایک ایک شعر اس کا　　ہاں غزل چھیڑ کرشن موہن کی

علقمہ شبلی

نسرین و نسترن بھی ہیں، سرو رواں بھی ہے
پھولوں کی انجمن میں دل خوں چکاں بھی ہے
کیوں خندہ زن ہوس ہے مرے اضطراب پر
اہل وفا میں ہمت ضبط فغاں بھی ہے
چھیڑیں نہ شیخ تذکرۂ حوران سیم بر
میری نظر میں جلوہ گہ بتاں بھی ہے
گذرا ہے کون دل میں بہ انداز دلبری
اب چشم اشک بار تبسم فشاں بھی ہے
کیا شرح کیجئے نگہہ دل نواز کی
جاں بخش بھی ہے اس کا کرم جاں ستاں بھی ہے
انکار میں ہے گرمیٔ جذبات بھی شریک
سینہ میں مرے دماغ کے دل کی زباں بھی ہے
شبلی! اٹھو کہ مانگ رہی ہے سہاگ آج
یہ زندگی حسین بھی ہے نوجواں بھی ہے

تہذیب عاشقی

صلاح الدین نیر

عجیب رسم ہے تہذیب عاشقی کی ندیم
تمہارے پاس میں آکر بھی کچھ نہ کہہ سکا
تمہارے پاس میں آیا تمہارے کہنے پر
تمہیں خبر بھی ہوئی تم مگر نہیں آئیں
مرے خیال میں بے چین تم بھی ہوگی مگر
یہ مصلحت کا تقاضہ بھی کیا تقاضہ ہے
تمہارے گھر میں تھی تقریب لوگ آئے تھے
مری نگاہ مگر تم کو ڈھونڈتی ہی رہی
تمہیں نہ پا کے مری آرزو پہ جو گذری
مرے ندیم اسے بتانے سے فائدہ کیا ہے
ہر ایک سانس میں سو بار یاد کرتا تھا
"کیا ر حسن" میں رہ رہ کے آہ بھرتا تھا
ہر ایک لمحہ یہ دل پر گماں گذرتا تھا
کسی طرح مجھے اپنی جھلک دکھا دوگی
مگر وہ تشنہ نگاہیں جو میری قسمت میں
مجھے نصیب ہوئی تشنہ آرزو کی طرح
تمہارا زخمی وہ لہجہ تمہاری وہ آواز
جو میرے کانوں میں امرت سا گھول دیتی تھی
مرے نصیب میں لہجے کا وہ گداز نہ تھا
اسی طرح کئی لمحے کئی منٹ، گھنٹے
گذار دیے میں نے محبت کی آبرو کے لیے
تمام عمر کی بے چین آرزو کے لیے
مگر وفا کا ہمیشہ ہی سر بلند رہا
مرے خلوص کی آنکھوں سے خوں ٹپکنے لگا
تمہارے بام سے جب سارے لوگ اٹھنے لگے
نگاہیں میری، تمہاری نظر سے ٹکرائیں
تمہاری کج ادا تھی وہی سادگی وہی انداز
خدا کچھ اور کرے بانکپن کی عمر دراز

یاد

موسیٰ کلیم

نیل گگن پر
اجلے اجلے
ابر کے ٹکڑے
یوں آتے ہیں
جیسے دل کے دروازے پر
یاد کے پردے
لہراتے ہیں۔

فرید برہانپوری

مفتاح السرور عادل شاہی

(گذشتہ سے پیوستہ)

"مفتاح السرور کے مولف نے بادشاہ کا نام صرف عادل شاہ لکھا ہے۔ جناب انصار اللہ صاحب کے خیال کے مطابق مالوہ کے کسی بادشاہ کا ذکر ہوتا تو اس کا پورا نام لکھنا ضروری تھا۔"

(ہماری زبان ۸ دسمبر ۱۹۶۶ء)

عاجز راقم کے خیال کے مطابق مولف مذکور نے خاندیس کے فاروقی سلطان ... عادل ... الملقب بہ اعظم ہمایوں (۹۱۱ھ - ۹۲۶ھ) کو عادل شاہ لکھا ہے۔

جامع مسجد برہانپور اور جامع مسجد اسیر گڑھ کی شمالی محرابوں میں عربی اور سنسکرت میں جو کتبات ہیں۔ ان میں مرقوم ہے۔

"السلطان ابن السلطان ابن السلطان ... عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ الفاروقی العمری و العدوی"

"یہ مساجد راجہ علی خان المعروف بہ عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے بنوائی تھیں۔"

عادل خان کے دو فرد خاندیس کے تخت پر متمکن ہوئے۔

(۱) ... عادل شاہ (۹۲۶ھ - ۹۳۱ھ)

(۲) میران مبارک شاہ بن عادل شاہ (۹۴۰ھ - ۹۷۴ھ)

شادی آباد مانڈو کے ... حسن غوثی نے عادل شاہ فاروقی کو اپنی تصنیف گلزار ابرار میں علی عادل شاہ لکھا ہے۔

(ملاحظہ کیجیے گلزار ابرار، قلمی نسخہ ورق ...
(۲) اذکار ابرار صفحہ ۲۲۳)

(۳) مولف مفتاح السرور کے بزرگ نسلاً در نسل خلجی شہزادوں سلاطین کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ کافروں کے جور و ستم سے تنگ آکر مولف مذکور اپنے وطن مالوف سے "الفرار مما لا یطاق من سنن المرسلین" کہہ کر ہجرت کرتا ہے۔

"از حوادث روزگار و بازیچہ چرخ مکار
ظلم و تعدی کفرہ ... بر ستمدیدہ اہل آن دیار
از حد گذشت و مسلمانان وضیع و شریف در ولایت در
قلعہ و شہر بند دراسیر ایشان گشتند۔"

سلاطین مالوہ میں سلطان محمود بن ناصر الدین خلجی کا دور فترت و اضطراب" اور خانہ جنگی کا دور تھا۔[1]

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم (اردو ترجمہ) صفحات ۴۱۶ سے ۴۲۱

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ محافظ خان اور صاحب خان کی سلطان محمود سے جنگ، اقبال خان اور مخصوص خان کی شہزادہ شہاب الدین اور اس کے لڑکے کو تخت پر بٹھانے کی ناکام کوششیں اور اس سلسلہ میں سلطان محمود سے جنگ، سکندر خان کی بغاوت اور اس کی ناکامی۔ شادی آباد مانڈو کی تاریخ میں مسلسل اختلال کا زمانہ ہے۔ ان مہمات میں سلطان کی مدد کرنے اور اس کو کامیاب بنانے کی وجہ سے میدنی رائے اور راجپوتوں کو عروج حاصل ہوگیا اور ان کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سلطان کی بے بسی اور میدنی رائے کے عروج سے خوف زدہ ہو کر بہجت خان۔ حاکم چندیری۔ نے سلطان سکندر لودھی کو دہلی لکھا تھا کہ "کفار راجپوتوں نے مسلمانوں پر غلبہ پالیا ہے۔ قدیم ملازمین اور خیر خواہوں کو بلا قصور قتل کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ بھاگ کر اطراف و جوانب میں پراگندہ ہوگئے ہیں۔ مسجدوں اور مدرسوں پر بے دینوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ سلطان محمود تہی دست ہے اور راجپوتوں اور میدنی رائے کے عروج سے پشیمان ہے۔"

اس عرصہ میں شاہ مظفر گجراتی نے دھار پر حملہ کیا اور سکندر خان نے علم بغاوت کرکے سلطنت میں خلل ڈالا۔ میدنی رائے نے ان سب کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔

محافظ خان (خواجہ سرا) اور صاحب خان کی کمک کے لیے دہلی کا جو لشکر آیا تھا، وہ واپس لوٹ گیا۔

صاحب خان اور بہجت خان کے حکم سے خواجہ سرا محافظ خان شادی آباد کی طرف ... ہوا۔

سلطان کی طرف سے حبیب خان اور فخر الملک نے راجپوتوں کی مدد سے ظفر آباد کے قریب اس کو شکست دی۔ محافظ خان مارا گیا۔

سلطان محمود نے فتح یاب ہوکر شادی آباد کی طرف مراجعت کی اور میدنی رائے کی رائے ناصواب سے امراء اور افسران سپاہ کو بے دریغ اور بے گناہ قتل کرنا شروع کردیا۔ محمود خلجی کا مزاج امراء اور مسلمانوں سے پھر گیا۔ حکام کو معزول کرکے ان کی جگہ میدنی رائے کے "انصار و اعوان" کو مقرر کیا۔

اکثر امراء اور ملازمین سلطان کے اس ناگوار فعل سے شکستہ دل ہوکر اپنے اہل و عیال کو لے کر شادی آباد سے ہجرت کر گئے۔

شادی آباد جو دار السلم اور فضلاء و مشائخ کا مامن تھا کافروں کا مسکن بن گیا۔

مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان و مال خطرہ میں پڑ گئے۔ راجپوتوں کے تسلط سے اہالیان شادی آباد آزردہ خاطر ہوگئے تھے۔

ان حالات میں مجبور ہوکر سلطان محمود نے مظفر گجراتی

اور عادل خان فاروقی (حاکم خاندیس) کی مدد سے راجپوتوں سے نجات حاصل کی۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔

(۱) تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ

جلد چہارم ص ۳۴۳-۵۲

(۲) تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) جلد دوم، ص ۴۱۲-۴۴۳

(۳) جناب انصار صاحب نے لکھا ہے کہ عادل شاہی علاقہ کے امن و سکون اور خوش انتظامی کے سبب مؤلف مفتاح السرور نے اس ریاست کا قصد کیا۔

(۴) مؤلف مذکور بماہ محرم الحرام ۹۲۳ھ کو برہان پور پہنچا۔

دار السلام برہان پور، خاندیس کے حکمران، فاروقی سلاطین کا پایۂ تخت تھا۔

خاندیس۔ عموماً صوبہ دار السرور برہان پور کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل علاقے شامل تھے۔

آسیر۔ بگلانہ۔ جاگیر گھرتون کا لغہ۔

نذر آباد۔ وغیرہ

ملاحظہ کیجیے۔ تاریخ رشید الدین خانی ص ۸

تاریخ خورشید جاہی ص ۸۰-۹۴

تاریخ گلزار آصفیہ ص ۱۰۵-۱۱۵

دار الظفر بیجاپور (عادل شاہیہ) میں مندرجہ ذیل علاقے شامل تھے۔ حسن آباد گلبرگہ، اکوندی، محمود نگر (تنبیر) آعظم نگر، ملکہ پور، بیجاپور، امتیاز گڑھ ادھونی۔ مصطفےٰ آباد داکول مرتضےٰ آباد مرج۔ فیروز نگر ماگجور۔ جنگاپور۔

بیدر شاہ درگ عزت نزاد۔ نصرت آباد سگر شاہ پور۔ اسعد نگر عزت الکوٹ۔ غازی پور۔ تلدرگ۔ توکل۔ مدگل۔ رئیباغ۔

ملاحظہ کیجیے۔

تاریخ خورشید جاہی ص ۹۸

گلزار آصفیہ ص ۵۳۱

تاریخ رشید الدین خانی ص ۱۰۱

عادل شاہی علاقہ میں برہان پور بھی شامل نہ تھا۔

علماء و صلحاء کا مرکز۔ برہان پور دار السرور۔ دکن میں نسبتاً پر امن اور "محفوظ" مقام تھا۔

۹۰۸ھ میں محمود شاہ بہمنی۔ قاسم برید۔ احمد نظام شاہ والی احمد نگر اور قطب قلی شاہ کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فتح اللہ عماد الملک کے مشورہ سے یوسف عادل شاہ نے خود برہان پور میں پناہ لی تھی۔

ملاحظہ کیجیے۔

(۱) طبقات اکبری (انگریزی ترجمہ) ص ۱۲۹

(۲) تاریخ ذکاء اللہ جلد چہارم ص ۳۵۳

(۳) تاریخ فرشتہ جلد دوم۔ (اردو ترجمہ) ص ۲۲

(۴) مرقع دکن ص ۲۱۴

(۵) واقعات مملکت بیجاپور ص ۳۶ حصہ اول

(۲) (۶) مفتاح السرور کا مؤلف ۹۲۳ھ کو برہان پور پہنچا۔ جناب انصار صاحب نے بعد کی عبارت میں لکھا ہے۔ کہ یہ وقت تھا کہ یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے بعد حد سلف سے گوا پر پرتگالیوں کے حملہ اور گوا کی بازیافت کا ذکر ہے۔

(ہماری زبان ص ۳۰۴ ۸ دسمبر ۱۹۹۶)

پرتگالیوں نے گوا پر ۱۵۱۰/۹۱۵ء میں حملہ کیا تھا۔ حملہ کے دو ماہ بعد یوسف عادل شاہ نے گوا فوج بھیجی۔

ملاحظہ کیجیے۔

(۱) تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ جلد دوم) ص ۲۳

(۲) تاریخ ذکاء اللہ ص ۳۵۳ (جلد ۴)

(۳) واقعات مملکت بیجاپور ص ۳۶

4- THE PROTUGUESE IN INDIA VOL-I
BY F.C. DANVERS P182-219

5- PROTNGUESE RULE IN INDIA
BY R.P. RAO— P30

یوسف عادل شاہ کی وفات کے چھ سال بعد اور گوا کی مہم ختم ہونے کے سات سال بعد مفتاح السرور کا مؤلف خاندیس کے دار الحکومت برہان پور میں پہنچا۔

(۷) بادشاہ کی جنگی مصروفیتیں۔

داؤد خان فاروقی کی وفات (۹۱۴ھ) کے بعد عادل خان (اعظم ہمایوں) کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے استقلال کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑی۔

حسام الدین نے خان زادہ "عالم خان" کی حمایت میں اپنی جان گنوائی۔

حسام الدین کے انتقال کے بعد شیر خان اور سیف خان جو قلعۂ اسیر پر متصرف تھے۔ عالم خان کی حمایت میں کھڑے ہوگئے ان کی دعوت پر عالم خان، احمد نظام شاہ بحری (والی احمد نگر) راجہ کالنہ اور ان کی افواج کے ہمراہ خاندیس کی سرحد پر پہنچا ان مفسدوں اور شر پردازوں کے فتنہ و فساد کی اطلاع عادل خان نے سلطان محمود کو دی۔

مظفر شاہ گجراتی نے دلاور خان اور صفدر خان کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج اور بارہ لاکھ روپے نقد بھیجا۔

یہ اطلاع پاتے ہی احمد نظام شاہ لوٹ گیا۔ شیر خان اور سیف خان اسیر گڑھ سے نکل کر گاول گڑھ (گاویل) کی طرف چلے گئے۔

عادل خان نے راجہ کالنہ کے علاقہ پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کیا اور راجہ سے خراج وصول کیا۔

ملاحظہ کیجیے۔

(۱) تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ)

جلد دوم صفحہ ۵۲-۲۵۰

(۲) تاریخ ہندوستان

جلد چہارم صفحہ ۶۷-۳۷۱

(۳) تاریخ ہندوستان (انگریزی ترجمہ)

HISTORY OF THE RISE OF THE MOHAMMEDAN POWER IN INDIA BY JOHN BRIGGS VOL- IV

(P 305- 307)

(۸) ترقیمہ کی عبارت۔

ترقیمہ کی عبارت سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) کاتب محمد کاظم ابن محمد قاسم ہے۔

(۲) سن کتابت ۱۰۰۰ ہجری ہے۔

(۳) کتاب برہان پور میں نقل کی گئی ہے۔

(۴) زیر نظر نسخہ کی کتابت مولف کے برہان پور آنے کے ۷۸ سال بعد کی گئی ہے۔

جناب انصار اللہ صاحب نے لکھا ہے۔ کہ "اگرچہ کہیں اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ نسخہ کا کاتب مولف کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔"

مفتاح السرور کا مولف پچاس سال کی عمر میں ۹۲۲ھ میں برہان پور پہنچا۔ زیر نظر نسخہ کی کتابت اس واقعہ کے ۷۸ سال بعد کی گئی۔

اگر کاتب کو مولف کا بیٹا تسلیم کیا جائے تو اس کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ اتنی پختہ عمر میں مولف کا بیٹا روائتی طور پر کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔

اقتباسات کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر نسخہ کا کاتب کم سواد ہے۔

محمد قاسم کی رعایت سے حکیم قاسم بیگ کا ضمناً ذکر کیا گیا ہے بعد کی سطروں میں یہ نام۔ حکیم قاسم۔ قاسم بیگ اور محمد قاسم۔ تین مختلف طریقوں سے لکھا ہوا ملتا ہے۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ

مفتاح السرور کا نامعلوم مولف اپنے وطن مالوہ میں فتنہ و فساد پھیل جانے کے باعث ہجرت کر کے ۹۲۲ھ میں خاندیس کے حاکم نشین شہر برہان پور پہنچا۔

اس وقت عادل خان اعظم ہمایوں خاندیس کے تخت پر متمکن تھا اور اپنے "استقلال" کے لیے وہ فوجی جد و جہد میں مصروف تھا۔

دکن میں مالوہ اور خصوصاً برہان پور نسبتاً پرامن اور محفوظ مقام تھا۔ گجرات اور مالوہ کے علاوہ قرب و جوار کی دیگر ریاستوں کے امراء اور شہزادگان نے آسیر کے حصار میں پناہ لی ہے۔

برہان پور علماء و فضلاء کا مسکن تھا۔ اس مردم خیز سرزمین سے کئی بزرگ اٹھے اور کچھ دیگر مقامات سے آکر اس کی دامن گیر خاک میں ابدی آرام کے مزے پا رہے ہیں۔

برار میں عماد شاہیہ کے زوال کے بعد اکثر علماء اور صلحاء نے برہان پور کا رخ کیا۔ یہاں آباد ہو کر عوام و خواص کی رشد و ہدایت درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں زندگی کے دن آرام سے بسر کر دئے۔

(کشف الحقائق قلمی ورق ۵۲ ب)

صوفیاء اور صلحاء نے بھی اس مقام کو ترجیح دی ہے۔ گجرات سے شاہ بہاء الدین باجن رح، شاہ شرف الدین شہباز رح، شیخ محمد لشکر عارف رح، شیخ برہان ظلوی رح، آکر یہاں توطن اختیار کیا۔ ان کے فیوض باطنی اور انوار روحانی سے ہر دور میں عوام و خواص مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

شاہ کلیم اللہ دہلوی رح نے برہان پور کی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر شیخ نظام الدین کو لکھا تھا۔ کہ برہان پور کو اپنا وطن بنالیں۔

(مکتوبات کلیمی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۴۴۷)

مفتاح السرور کے مولف اور وطن کے بارے میں سر دست کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے۔ خاتمہ کی عبارت اور اندرونی شواہد سے ان امور پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

مراسلات

امانت کی اندر سبھا کے بارے میں ایک اور مراسلہ

"ہماری زبان" کے یکم نومبر اور ۸ر نومبر کے شماروں میں میرا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ایک صاحب کی ترتیب دی ہوئی "اندر سبھا" کے ضمن میں تھا جس میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ امانت کی اندر سبھا ہے۔ اس پر بہت سی بحثیں آئیں۔ اس مضمون کے جواب میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا ایک خط ۸ر دسمبر ۶۶ء کے شمارے (ہماری زبان) میں شائع ہوا جس میں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے بڑی چابکدستی سے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے نظریات کی تردید انہی (پروفیسر رضوی) کے الفاظ میں کی ہے۔ دوسری بات منظوم ڈراموں کے سلسلے میں ہے۔

اس سلسلے میں میرا معروضہ یہ ہے کہ اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو کھٹکا دینا میرا مقصد نہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یوں ہی غلط روایتوں اور منقولات کی کیا کمی ہے کہ اس میں اور اغلاط شامل کرکے آنے والی نسلوں کو محض اپنی بات رکھنے کے لیے گمراہ کیا جائے۔ میں نے نہ کبھی اس کی کوشش کی ہے اور نہ اسے مستحسن سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بحث و تمحیص سے صحیح راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں زیر بحث مضمون بھی اسی کی ایک ادنیٰ کوشش تھا۔ بحث برائے بحث میرا مطمح نظر نہیں۔ میں نے کہیں مسعود حسن رضوی صاحب کی تحقیقات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف موصوف کی کتاب سے استفادہ کرکے اپنے اثبات کو اور جامع بنانے کے لیے ان کی تحریروں سے حوالے دیے ہیں کیونکہ میں پروفیسر موصوف کو اس سلسلے میں مستند مانتا ہوں۔ حیرت ہے کہ نامی صاحب نے یہ نتیجہ کہاں سے نکال لیا کہ میں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تحقیقات کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور یہ کہ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ واجد علی شاہ نے کوئی اندر سبھا لکھی تھی جسے دیکھ کر امانت نے اپنی اندر سبھا لکھی۔

جہاں تک منظوم نمونوں کو ڈرامہ ماننے یا نہ ماننے کا سوال ہے میں ڈاکٹر نامی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ میرا مضمون پھر سے پڑھنے کی زحمت کریں۔ میں نے ان کی کتاب "ہندوستانی تھیٹر" سے اس سلسلے میں کہیں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ اس مضمون کا حوالہ دیا ہے جو اگست ۱۹۶۶ء کے "شاعر" میں "اردو کا پہلا دستیاب ڈرامہ۔ خورشید" کے نام سے چھپا تھا اس مضمون میں موصوف نے ایک جگہ "خورشید" کی اولیت کو سراہتے ہوئے "اندر سبھا" کے متعلق لکھا ہے کہ

"جب تک اس قسم کے بے جڑ پیچ اور بے معنی بیانات اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے، اردو تھیٹر کی صحیح تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی۔"

موصوف کی اس عبارت سے ہر شخص یہی نتیجہ نکالے گا کہ موصوف اندر سبھا کو ڈرامہ نہیں مانتے اور غالباً اسی وجہ سے کہ وہ منظوم ہے۔ ورنہ اور کیا وجہ اس انکار کی ہو سکتی ہے؟ کیونکہ کسی بھی ادب کی تاریخ میں ابتدائی نقوش، شاہکاروں کا تو مقابلہ کبھی نہیں کر سکتے۔ اندر سبھا بہر حال اردو ڈراموں کے بچپن کے دور ہی کا ڈرامہ ہے اور ابتدائی کوششوں میں سے ایک کوشش ہے ابتدائی کوششوں کا محاسبہ مصنفین کی مجبوریوں اور اس زمانے کی محدود صورتوں ہی کو سامنے رکھ کر کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی کے ابتدائی ڈرامے شیکسپیئر اور بن جانسن کے ڈراموں کے معیار پر کیسے پورے اتر سکتے ہیں۔ پھر اس حالت میں ڈاکٹر نامی خورشید کو اندر سبھا سے کیونکر بہتر کہہ سکتے ہیں۔ موصوف کے اوپر پیش کیے ہوئے جملے ہی سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید وہ اسی لیے اندر سبھا کو ڈرامہ نہیں مانتے کہ وہ منظوم ہے اور "خورشید" کو اسی لیے اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ قرار دیتے ہیں کہ شاید نثر میں ہوگا۔ ڈاکٹر نامی اپنی کتاب "اردو تھیٹر" کے صفحہ ۲۳۸ پر یہ بھی لکھتے ہیں۔

"بعض لوگ خورشید کو بھی اردو کا پہلا ڈرامہ کہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گجراتی اسٹیج کے چیدہ چیدہ اداکاروں نے پہلی بار مشترکہ طور پر ایک اردو کھیل میں کام کیا اور شہرت پائی خورشید امید سے زیادہ کامیاب رہا۔"

ہم اس سے کہ اوپر بیان کی ہوئی وجہ سے یہ ڈراما اردو ڈراما ہوگیا، یہ بات بھی محل نظر ہے کہ اس عبارت کے بعد ڈاکٹر نامی نے مسز کھمباتا کا دیباچہ نقل کیا ہے جس میں اس ڈرامے کو اصلاً گجراتی ڈراما بتایا گیا ہے۔ اقتباس بہت لمبا ہے چند سطریں کام کی یوں ہیں۔

"لیکن دادا بھائی پٹیل اس سے بددل نہ ہوئے۔ انھوں نے ایدل جی کھوری سے ایک ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن وہ اردو زبان سے واقف نہیں تھے اس لیے انھوں نے ایک ہندو ڈراما "کاماوتی" سے پلاٹ اخذ کرکے ایک ڈراما بنام سونا۔ نا۔ موں۔ لی خورشید گجراتی زبان میں لکھا۔"

پھر بعد کو یہ گجراتی ڈراما کس طرح اردو میں بدقت تمام ترجمہ کیا گیا۔ یعنی اصلاً یہ ڈراما گجراتی میں تھا۔ اردو میں اس کا ترجمہ

پیش ہوا اور وہ بھی ۱۸۷۱ء میں۔ اگر مسٹر کھنباتہ کا بیان صحیح ہے تو پھر ڈاکٹر گلکرسٹ کے شیکسپیئر کے ترجموں کو اردو کا پہلا ڈراما کیوں نہ مانا جائے جس کے کچھ حصے ۱۸۰۱ء میں ان کی لکھی ہوئی اردو قواعد کے ساتھ چھپے تھے۔ پھر چارلس اسمتھ کے سنو گشال مطبوعہ ۱۸۰۲ء (بقول ڈاکٹر نامی۔ اردو تھیٹر جلد اول) کو اردو کا پہلا ڈراما کیوں نہ مانا جائے۔ پھر واجد علی شاہ کے رہسوں اور امانت کی اندرسبھا کو اولیت کیوں حاصل نہیں جو بالترتیب ۱۸۴۳ء اور ۵۳-۱۸۵۱ء سے لکھنؤ کے شاہی اور عوامی اسٹیج پر پیش کیے جاتے رہے اور کسی مقامی یا غیر مقامی زبان کے ترجمے نہ تھے اور جو پورے پورے آج بھی دستیاب ہیں۔ ہاں اگر ڈاکٹر نامی اندرسبھا اور اس سے پہلے کے رہسوں کو درجہ نہیں اس لیے دیتے کہ ڈراما کے لفظ سے لوگ اس وقت تک آشنا نہ تھے، ایک سرے ہی سے ڈراما ماننے کو تیار نہیں تو ایسی صورت میں اس مسئلے پر کم از کم میرے لیے مزید بحث کا سوال ہی نہیں اٹھتا کیونکہ میں بہرحال واجد علی شاہ کے رہسوں اور امانت کی اندرسبھا کو اردو ڈرامے کے ابتدائی نمونوں میں شامل سمجھتا ہوں۔

رہ گئی رہس منزل کی بحث، تو اس بحث کے لیے میں اپنے کو اہل نہیں پاتا۔ ڈاکٹر نامی بہتر جانتے ہوں گے کہ "رہس منزل" ایک "چبوترے" کا نام تھا یا کسی شاہی محل کا۔ اور واجد علی شاہ کی بیگمات صرف "رنڈیاں منڈیاں" تھیں یا کیا تھیں۔ اس سلسلے میں میری معلومات بہت محدود ہیں۔ ڈاکٹر نامی کی عبارت اس سلسلے میں یوں ہے۔

"واجد علی شاہی دور کے کسی مصنف کی عبارت سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ لکھنؤ میں کبھی بھی تھیٹر تعمیر ہوا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ واجد علی شاہ نے کسی چبوترے کا نام رہس منزل رکھ دیا ہو۔ کیونکہ جو شخص چوک کی رنڈیوں منڈیوں کو جلیل القدر خطابات سے نواز سکتا ہے وہ دو کوڑی کی چیز کو بھی بام فلک تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ اودھ کی تاریخ اور حالات پر نجم الغنی، کمال الدین حیدر اور کرنل سلیمن کے علاوہ غلام علی (عماد السعادت) محمد فیض بخش (تاریخ فرح بخش)، کیپٹن برڈ (SPOLIATION OF OUDH)، جیمس مل (تاریخ ہند)، کیپٹن جے بیٹسن (THE BRITISH GOVT. AND THE KINGDOM OF OUDH)، ڈاکٹر بی پاسو (اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی)، پادری ہیبر (HEBER)، ابو طالب (تفضیح الغافلین)، آشیرباد ی لال (اودھ کے پہلے دو نواب اور شجاع الدولہ) جیسے عصری اور اس دور کے ماہرین مورخوں کی مستند اور با تحقیق تاریخوں اور خیالات کو پڑھ کر تب واجد علی شاہ اور اودھ شاہی کے متعلق رائے قائم کی جائے تو بہتر ہوگا۔ نہ یہ کہ انگریزوں کے پٹھوؤں نے جو کچھ ان کے اشارے سے لکھ دیا اسی کو حرف آخر سمجھ کر اسی پر اپنے اثبات کی بنیاد قائم کی جائے۔ اودھ کی صحیح تصویر بغیر ان تاریخوں کے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا مکمل نہیں ہوتی۔ اردو میں بھی میری معلومات کے مطابق پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر محمد حسن اور مرزا کوکب قدر صاحبان نے اودھ کا تہذیبی مطالعہ اچھی طرح کیا ہے۔ وہ اس بات کا مناسب جواب دے سکتے ہیں کہ "رہس منزل" اور واجد علی شاہ کی دوسری عمارتیں صرف "چبوترہ" تھیں یا کیا۔ بیگمات کی اصلیت کیا تھی۔

(سید محمد عقیل)

"غزل نیاز کی نہیں"

مکرم محمد الیاس برنی صاحب نے اپنی کتاب "جذبات فطرت" جلد چہارم میں "نامرادی" کے عنوان سے مندرجہ ذیل اشعار کو نیاز کے نام سے منسوب کیا ہے۔

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا!
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا
ابھی آنکھ جھپکی تھی ایک پل تو کہا کسی نے کہ اٹھ کے چل
دل بے قرار نے آن کر مجھے چٹکی لے کے جگا دیا
نہ تو تاب ہے تن زار میں نہ قرار ہے غم یار میں!
مجھے سوز عشق نے آخرش یونہی مثل شمع گھلا دیا

(جذبات فطرت - زیر نگرانی مسلم احمد نظامی ایم اے کتب خانہ نذیریہ دہلی)

دراصل یہ بہادر شاہ ظفر کی غزل کے منتخب اشعار ہیں حوالے کے لیے دیکھیے "انتخاب کلام ظفر" (مرتبہ شاہد علی خاں) البتہ دوسرا شعر اس طرح ہے ـــ

ابھی آنکھ جھپکی تھی ایک پل کہا مجھ سے جی نے کہ اٹھ کے چل
دل بے قرار نے او میاں وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

(امیں نورالحسن انور ادیب)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ ایسوسی ایشن کا جلسہ

شعبۂ اردو کے ریسرچ ایسوسی ایشن کا دوسرا جلسہ

گذشتہ ماہ میں اردو سیمنار میں زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا۔ جناب کوکب قدر سجاد علی مرزا نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات" کا ایک باب بعنوان "واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط" پڑھا۔

مقالہ نگار نے واجد علی شاہ کے مرتب کیے ہوئے خطوط کے مجموعوں کا حوالہ دیتے ہوئے مختلف دلائل سے واضح کیا کہ ان مجموعوں میں وہ تمام خطوط شامل نہیں ہیں جو بیگمات نے واجد علی شاہ یا واجد علی شاہ نے بیگمات کو بھیجے تھے۔ ادنیٰ اندازے کے مطابق دو ڈھائی ہزار خطوں میں سے صرف دو ڈھائی سو خط ان مجموعوں میں شامل ہو سکے ہیں اور یہ خط تاریخی ادبی لسانی اور سوانحی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے خطوں کی امتیازی خصوصیت ان کی سادگی، صفائی اور مکالماتی انداز تحریر ہے جس پر اکثر صاحبان نظر نے کم توجہ دی ہے۔ بیگمات کے خطوں کو تمام مبصرین نے بلا استثنیٰ بیگماتی زبان کا نمونہ قرار دیا ہے لیکن ان تمام خطوں میں جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں ایک خط بھی ایسا نہیں تھا جسے یقین کے ساتھ کسی بیگم سے منسوب کیا جا سکے۔ بیگمات کا مجموعی حیثیت سے ناخواندہ ہونا خود ان کے خطوں سے ثابت ہے اور واجد علی شاہ کے مرتب کیے ہوئے مجموعے اگر موجود نہ ہوتے تو ایک غلط خیال کی تردید کا کوئی عمدہ ذریعہ موجود نہ ہوتا کیونکہ جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں یہ حقیقت مسخ کر دی گئی ہے۔

شعبۂ اردو کے اساتذہ اور کچھ ریسرچ کے طلبا نے اس کے بعد بحث میں حصہ لیا اور مقالہ نگار کی بعض تحقیقات کو بہت سراہا اور کچھ مشورے بھی دئے۔ آخر میں صدر جلسہ محترم سرور صاحب نے بھی اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مقالے سے واجد علی شاہ کے خطوط کی ادبی اہمیت کو ظاہر کرنے کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو جاتا ہے اور یہ تحقیق کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صدر صاحب نے لکھنؤ کی زبان کے تجزیے اور بعض مسائل کو تفصیل سے درج کرنے کی صلاح دی تاکہ مکتوب نگار کی شخصیت کے دوسرے پہلو سامنے آسکیں۔

ریسرچ ایسوسی ایشن کا یہ دوسرا جلسہ بھی پہلے جلسے کی طرح کامیاب ہوا۔

(عبد الغفار شکیل)

رائٹرس ایسوسی ایشن ہوڑہ کی ادبی نشست

رائٹرس ایسوسی ایشن ہوڑہ نے سرسوتی پوجا کے موقع پر ۲۶ فروری ۷۶ کی شام کو رام کرشن پور ہوڑہ میں ایک شاندار جلسہ اور مخصوص اردو ہندی مشاعرہ منعقد کر کے ایک ساتھ "یوم غالب" اور "نرالا دیوس" منایا۔

صدارت کے فرائض شری شیو شنکر سنگھ نے انجام دیئے۔ نرالا کی "بانی بندنا" اور غالب کی غزلیں کرشن کشور سنگھ، محمد ادیب اور محمد اسرائیل نے ترنم کے ساتھ پیش کیں۔ اردو اور ہندی کے دونوں عظیم شاعروں کی زندگی اور فن پر مقالات پڑھے گئے اور دونوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

ان مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب قیصر شمیم اور شری الکھ نرائن نے اپنی اپنی تقریروں میں غالب اور نرالا کے حیات و فن کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔

آخر میں اردو۔ہندی مشاعرہ ہوا جس میں جناب قیصر شمیم، خالق عبد اللہ، بشیر آزری، حشمت فتح پوری اور سیفی اعظمی نے اپنا اردو کلام اور شری گوپال پرساد اور شری دھرودیو شرما شاستری نے اپنی ہندی نظمیں سنائیں۔

اپنی صدارتی تقریر میں شری شیو شنکر سنگھ نے ایسوسی ایشن کی ان کوششوں کو سراہا جو اس نے مختلف زبانوں کے شعراء و ادباء کو متحد کرنے اور ایک دوسرے کے ادب کو سمجھنے سمجھانے کے مواقع فراہم کرنے کے سلسلے میں کی ہیں۔

(حشمت فتحپوری۔ سکریٹری)

"جواہر سے لال تک" کا رسم اجراء

بنارس۔ اردو اور ہندی کے مشہور و مقبول شاعر جناب نذیر بنارسی کے نئے مجموعۂ کلام "جواہر سے لال تک" (جو بیک وقت ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا ہے) کا جشن اجراء گذشتہ ۱۲ فروری کو بوقت ۴ بجے شام ہندی پرچار بھون میں منایا گیا۔ اس تقریب کی صدارت پدم شری، رام چندر ورما نے کی۔

"جواہر سے لال تک" کا افتتاح کرتے ہوئے مہاراشٹر کے سابق گورنر شری سری پرکاش نے کہا کہ شاعر اور ادیب پر سماج کی بہت ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ اپنی تخلیقی تحریروں کے ذریعے کار لاکر سماج کو بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔

ایک اچھا شاعر اور ادیب وہی ہے جو بگڑتے ہوئے سماج کو بنانے اور سنوارنے میں معاون ہو۔ آپ نے موجودہ شعراء و ادباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ شخصیت پرستی کو چھوڑ کر اپنا موضوع عام آدمی بنائیں۔ آخر میں آپ نے "جواہر سے لال تک" کی تخلیق پر جناب نذیر بنارسی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ وہ آئندہ بھی اپنی تخلیقات سے وطن، قوم اور انسانیت کی خدمت کرتے رہیں گے۔

آخر میں حفیظ بنارسی، امرت لال عشرت، سلام مچھلی شہری، عرش ملسیانی وغیرہ نے نذیر بنارسی کی تخلیق پر اظہار خیال کیا۔ اور آخر میں جناب نذیر بنارسی نے اپنی اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

انجمن ترقی اردو دہلی کے تحت یوم غالب

لیفٹننٹ گورنر دلی کی طرف سے دلی میں اردو کی ترقی میں امداد دینے کا اعلان

دہلی گذشتہ روز راجدھانی میں نہایت اہتمام کے ساتھ یوم غالب کی تقریبات منائی گئی۔ ان تقریبات کا اہتمام انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ نے کیا تھا حسب پروگرام مزار غالب واقع بستی نظام الدین میں دو اجتماعات ہوئے اور ان سے قبل مزار غالب پر گلپاشی کی رسم انجام دی گئی جس میں دلی کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر جھا نے بھی شرکت کی بعد ازاں غالب کی کچھ غزلیں قوالی کے طور پر گائی گئیں بزم مقالات اور بزم مشاعرہ کا انعقاد جو محل نزد مزار غالب میں عمل میں آیا۔ دونوں نشستوں میں دلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، دلی کالج، دیال سنگھ کالج، کروڑی مل کالج اور دوسرے مختلف تعلیمی اداروں کے اردو پروفیسر و اساتذہ کے علاوہ دلی اور نئی دلی کے ادیب شعراء اور بڑی تعداد میں دوسرے محبان اردو نے شرکت فرمائی۔

بزم مقالات کا افتتاح لیفٹننٹ گورنر مسٹر جھا نے فرمایا اور صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے صدر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے فرمائی۔ مسٹر جھا نے اپنی افتتاحی تقریر میں غالب کو بہترین الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ وہ دلی میں اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے سلسلہ میں جو مدد بھی دے سکتے ہیں وہ دیں گے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر پرمغز تھی۔ موصوف نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں روحانی اور زندگی کی حقیقی قدروں کو باقی رکھنے اور ان کی نشو و نما کرتے رہنے کے عمل کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ آج جس قومی یکجہتی پر زور دیا جاتا ہے اس کا بہترین مظاہرہ کلام غالب میں ملتا ہے۔ ترمذی صاحب نے غالب اور دفتری خانہ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے کلام کی روشنی میں ان کی شخصیت کا تجزیہ کیا۔ ابتدا میں انجمن ترقی اردو دلی کے صدر پنڈت سندر لال اور جنرل سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ نے گورنر اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کا خیر مقدم کیا۔ شام کو ۷ بجے طرحی مشاعرہ ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت حکومت ہند کی وزارت دفاع کے سکریٹری جناب دی شنکر نے فرمائی۔ جناب دی شنکر نے اپنے صدارتی خطبہ میں دلی میں اردو زبان کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرہ میں جن شعراء حضرات نے شرکت فرمائی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ علامہ انور صابری، روش صدیقی، شمیم کرہانی، نذیر بنارسی، سجاد وششت، خمار دہلوی، طالب دہلوی، رام کشن مضطر، رفعت سروش، حیات لکھنوی، گلزار دہلوی، عنوان چشتی منگلوری، بہار برنی، نجم مظفر نگری، ہیرا لال فلک، درشن سنگھ درشن

بزم مشاعرہ کا آغاز علامہ انور صابری کی نظم سے ہوا جس میں غالب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ بعد ازاں دونوں مطرحہ مصرعوں پر غالب کی غزلیں دلی کے مشہور موسیقار استاد نصیر خاں نے پیش کیں اور اس طرح یہ کامیاب محفل مشاعرہ دس بجے شب کو اپنے اختتام پر پہونچی۔ (الجمعیۃ دہلی)

بزم سخن اڑیسہ کا مشاعرہ

بزم سخن اڑیسہ (کٹک) کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ ناری سنگھ سدن کٹک میں منعقد ہوا۔ اڑیسہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس عزت مآب عالی جناب خلیل احمد مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک بزم ہوئے۔

افتتاحیہ نغمہ کے بعد پٹنہ سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب وفا ملک پوری مدیر صبح نو کے کلام کے ساتھ مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں تقریباً بیس مقامی شعراء کے علاوہ جناب سجن الہ آبادی، جناب جذب آروی، جناب مائل علی گڑھی، جناب حکیم منگلوری، جناب سراج الدین حیدرآبادی اور دوسرے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

جلسہ کے آغاز میں جناب امجد نجمی صدر بزم نے بزم کی روداد پر مشتمل ایک رپورٹ پیش کی۔ صدر بزم جناب امجد نجمی مدیر شاخسار نے اڑیسہ میں اردو کی ترویج و بقا کے لیے ایک اردو لائبریری، اردو پریس اور ادارہ برائے کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں سرکاری امداد کا مطالبہ کیا۔ جس پر شری گوری کمار برہما نے اڑیسہ ساہتیہ اکاڈمی کی جانب سے اردو کتابوں کو اشاعتی پروگرام میں حتی المقدور کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا۔ صدر بزم استقبالیہ جناب ایم۔ اے۔ امجد، ریٹائرڈ ڈپٹی مجسٹریٹ نے بزم سخن کے تعمیری کاموں کے سلسلہ میں دو ہزار روپیہ بطور عطیہ پیش کرنے کا اعلان فرمایا۔

مشاعرہ کے اختتام پر مولانا حفیظ اللہ نیولپوری نے اراکین بزم کی طرف سے جناب صدر، مہمان خصوصی، شعرائے کرام اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (عبدالصمد پرکی۔ بزم سخن کٹک اڑیسہ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا